North Asian International Research Journal of Multidisciplinary

IRJIF IMPACT FACTOR:6.019

ISSN: 2454-2326 Vol. 8, Issue-9 September-2022

Index Copernicus Value: 58.12 Indian Citation Index Thomson Reuters ID: S-8304-2016

NAIRJC A Peer Reviewed Refereed Journal

کشمیر میں اردو افسانے کی روایت ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ تک

افشانہ قیوم

ریسرچ فیلو

شیخ العالم سینٹر فار ملٹی ڈسپلنری سٹڈیز

یونیورسٹی آف کشمیر

کہانی انسان کی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے کیونکہ انسان خود ایک کہانی ہے۔ کہانی سننا یا سنانا ہمیشہ سے ہی انسان کا پسندیدہ مشغلہ رہا ہے۔ جب لوگوں کے پاس فرصت کے لمحات میسر تھے تو داستانوں کا چلن تھا پھر وقت کی تنگ دامنی کی وجہ سے اس کی جگہ ناول نے لے لی۔ اس کے بعد جب مشینی اور مادی دور نے وقت کے گھوڑے پر ایک تازیانہ لگایا تو افسانہ نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ بیسویں صدی کو افسانہ کی صدی قرار دیا گیا ہے۔ موجودہ دور کی نثری ادب میں سب سے زیادہ مقبول صنف افسانہ ہے۔ اردو افسانہ نے اپنی کمسنی میں جو منازل طے کر لیں ہیں وہ شاید ہی کسی دوسری صنف سخن نے طے کیں ہوں۔ اردو افسانہ ابتداء سے ہی کثیر الجہت ہونے کی وجہ سے زیر بحث رہا ہے۔

ریاست جموں و کشمیر میں اردو نثر کے باقاعدہ نمونے انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں ملتے ہیں۔ جن میں ہرگوپال خستہ کی نثری کتاب ''گلدستہ کشمیر'' کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اردو زبان کی مقبولیت کو دیکھ کر ڈوگرہ دور کے مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ۱۸۸۹ء میں اس کو باضابطہ طور پر سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ اسی دور میں اردو زبان کا چلن عام ہوا اور شعر و شاعری کی محفلوں کا بھی آغاز ہوا۔ کچھ عرصہ بعد شعری ادب کے ساتھ ساتھ اردو افسانہ کی کونپلیں بھی پھوٹنے لگیں۔ جہاں تک کشمیر میں اردو افسانے کا تعلق ہے تو اس کے ابتدائی نقوش بیسویں صدی سے ہی ملنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ابتداء میں یہاں افسانے روایتی اور رومانی انداز میں لکھے جانے لگے۔ لیکن رفتہ رفتہ لکھنے والوں کے شعور میں بیداری پیدا ہوئی اور فن افسانہ نگاری پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ ان کی صلاحتیں ابھرنے لگیں اور وہ اپنے افسانوں میں حقیقی زندگی کی عکاسی کرنے لگے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں سماجی، اقتصادی، سیاسی اور نفسیاتی باریکیوں کی عکاسی کی اور انہیں مقامی رنگ دیا۔ ان افسانہ نگاروں نے ابتدائی دور میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے ایسا ماحول پیدا کیا جس سے بعد میں آنے والوں کے لئے راہ ہموار ہوگئی۔ اس سلسلے میں پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''۱۹۳۰ اور ۱۹۴۰ کے درمیان، کشمیر میں کئی اچھے افسانہ نگار منظر عام پر آئے اور یہ صنف

اتنی مقبول ہوئی تھی کہ اکثر ذوق رکھنے والے قابل مطالعہ افسانے آسانی کے
ساتھ لکھ لیتے تھے۔''[1]

کشمیر میں جب افسانہ کی آمد شروع ہوئی تو یہاں تخلیق کاروں کے سامنے زندگی کے نجی مسائل کے ساتھ ساتھ شخصی راج کے ظلم وستم کی روداد بھی قلم بند کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ وہی دور تھا جب ڈوگرہ شاہی کا ظلم و جبر کشمیری عوام کی جڑوں کو کھوکھلا کر چکا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ سے ہی غلامی کی زندگی بسر کی ہے اور اب مزید بے بسی، لاچاری اور غربت میں پسے جا رہے تھے۔ جاگیردارانہ اور چک داری نظام کے تحت زمین داروں اور چک داروں کا استحصال، نوکر شاہی، رشوت خوری، ناخواندگی اور اقتصادی نابرابری کا دور دورہ تھا۔ لیکن جون ہی یہاں ترقی پسند تحریک کی لہر پہنچ گئی تو ہر طرف اسی رجحان کی آبیاری ہونے لگی۔ یہاں کے ادیبوں کا شعور بیدار ہوا اور وہ روایتی اور رومانی موضوعات کے ساتھ ساتھ باقی مسائل پر بھی سوچنے لگے۔ اور انہوں نے باقاعدہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر سماجی نابرابری، سیاسی استحصال، لاچاری و مفلسی اور طبقاتی کشمکش جیسے موضوعات کی عکاسی شروع کر دی۔ اس دور میں افسانہ نگاروں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ دیپک بدکی اس بارے میں لکھتے ہیں:

''۱۹۴۷ء سے پہلے جموں وکشمیر کے افسانہ نگاروں کا نصب العین شخصی راج کے خلاف
عوام کو بیدار کرنا اور ریاست کے باشندوں کو جاگیرداری کی صعوبتوں سے نجات دلانا
تھا۔ غربت، بھوک، افلاس، پسماندگی، معاشی اور اقتصادی بدحالی، بیکاری، طبقاتی
کشمکش اور بیگار کی لعنت مطلق العنانی اور جاگیرداری ہی کی دین تھے۔ اس دور کے
افسانہ نگاروں نے ان موضوعات کو اپنے افسانوں کا مدار بنایا۔ اس دور کو افسانے کا
زریں دور کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔۔۔[2]

افسانہ نگاری میں ریاست کے افسانہ نگار ملک کے ادبی حلقوں میں جانے پہچانے ہیں۔ ان کے افسانوں میں روایتی انداز بھی ملتا ہے اور وقت کے تقاضوں کے تحت بھی انہوں نے کئی قابل قدر افسانے رقم کیں۔ ان افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری کا واضح رجحان ملتا ہے۔ کشمیر کا پہلا افسانہ نگار کون ہے اس سلسلے میں محققین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعض محققین پریم ناتھ پردیسی کو یہاں کا پہلا افسانہ نگار تسلیم کرتے ہیں، جب کہ بعض محمد دین فوق کی نثری تحریروں میں افسانے کی ابتدائی جھلکیاں دیکھتے ہیں۔ اور کچھ لوگ تو تیرتھ کشمیری کو جموں وکشمیر کا پہلا افسانہ نگار تسلیم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر برج پریمی ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ریاست میں اردو افسانے کی طرف سب سے پہلے مورخ، ادیب، شاعر اور صحافی محمد دین فوق نے توجہ دلائی۔ اگرچہ فوق نے زندگی کا بیشتر حصہ پنجاب میں گزارا لیکن ان کی کشمیریت کے جذبے کے بارے میں دو رائے نہیں ہو سکتی۔ فوق نے روشِ زمانہ کے مطابق کئی تاریخی اور نیم تاریخی قصے قلمبند کیے جنہیں ہم ریاست میں اردو افسانے کے اولین نقوش کہہ سکتے ہیں''۔۳

کشمیر کے ابتدائی افسانہ نگار پر بات کرتے ہوئے جہاں برج پریمی نے محمد دین فوق کو اردو کا پہلا افسانہ نگار مانا ہے، وہیں دوسری طرف پروفیسر عبدالقادر سروری نے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ ریاست میں اردو کے باقاعدہ پہلے افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسی ہیں۔ اس حوالے سے وہ رقم طراز ہیں:

''افسانہ نگاری کا آغاز یہاں بھی، اس میں شک نہیں کہ روایتی، رومانی اور کسی حد تک رسمی انداز سے ہوا، لیکن جوں ہی ان ادیبوں کا شعور بیدار ہوا اور فن پر دسترس کا ایقان پیدا ہو گیا۔ ان کی اپنی ذاتی صلاحیتیں ابھرنے لگیں اور اپنی سرزمین کی حقیقی زندگی کے سماجی، معاشی، نفسیاتی اور بعض وقت سیاسی پس منظر والے افسانے سرانجام دیئے جانے لگے۔ جس سے جموں اور کشمیر کے افسانوں میں مقامی رنگ اور انفرادیت نمایاں ہونے لگی۔۔۔ افسانہ نگاری میں سب سے عظیم نام جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ پنڈت پریم ناتھ پردیسی ہے''۔۴

عبدالقادر سروری تیرتھ کشمیری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۱۹۲۳ء سے تیرتھ نے قلم اٹھایا اور اب تک بے تکان لکھ رہے ہیں اس عرصے میں ان کا کئی اخباروں کی ترتیب سے بھی تعلق رہا، لیکن نام کے ساتھ نہیں۔۔۔ تیرتھ اپنے افسانوں کیلئے مواد ہر گوشے سے حاصل کرتے ہیں۔ تاریخ، دسا تیر، عام زندگی اور اس کے اخلاقی پہلوؤں کے بارے میں انہوں نے کئی افسانے لکھے ہیں۔ مثلاً چندراولی، اندھی ماں، تلاش حق، جگ چھوٹا سرمایہ اخلاقی پہلو لئے ہوئے ہیں۔''۵

سروری کی ان باتوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جموں و کشمیر کا پہلا افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسی نہیں بلکہ تیرتھ کشمیری ہے۔ تیرتھ کشمیری کے افسانے اخلاقی موضوعات کی وجہ سے ایک مخصوص خول میں سمٹ کر رہ گئے تھے۔ اس کے برعکس پر

دیسی نے زندگی کے متنوع پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہوئے اعلیٰ پائے کے افسانے تخلیق کئیں ،جس سے پردیسی کی ایک خاص پہچان بن گئی ۔ برج پریمی ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''ریاست میں نثر کی طرف غالباً محمد الدین فوق مرحوم نے سب سے پہلے توجہ کی اور کچھ تاریخی اور نیم تاریخی قصے لکھے۔اس کے بعد چراغ حسن حسرت کا افسانوی مجموعہ ''کیلے کا چھلکا اور دیگر افسانے'' ۱۹۲۷ء میں لاہور سے شائع ہوا۔لیکن اس صنف کو باضابطہ اور باقاعدہ طور پر پریم ناتھ پردیسی نے ایک نیا رنگ دیا۔ان کے چراغ سے بعد کے تخلیق کاروں نے اپنے چراغ روشن کئے۔۔۔''[۶]

برج پریمی خود تضاد کا شکار ہوتے ہیں۔کیونکہ پہلے تو وہ فوق کو پہلا افسانہ نگار مانتے ہیں، پھر چراغ حسن حسرت کو ریاست کا پہلا افسانہ نگار گردانتے ہیں اور بعد میں پردیسی کو پہلا باضابطہ اور باقاعدہ افسانہ نگار کہتے ہیں۔سلیم سالک اس بارے میں لکھتے ہیں:

''جب اس مسئلہ پر باریک بینی اور سنجیدگی سے غور کرتے ہیں تو تیرتھ کشمیری کے افسانے اخلاق اور وعظ و پند کے دائرے میں سمٹ کر رہ جاتے ہیں،تکنیک اور اسلوب کے حوالے سے ان میں انشائیہ پن زیادہ ملتا ہے اس لئے ان کو اس دور میں زیادہ اہمیت نہیں ملی ۔چراغ حسن حسرت بسیار نویس تھے وہ کئی اخباروں کے ساتھ منسلک ہونے کی وجہ سے اکثر و بیشتر لاہور میں ہی قیام پذیر ہوتے۔ان کی تحریریں مضامین اور کالم نوعیت کی ہوتی تھیں۔۔۔ اس کے برعکس پریم ناتھ پردیسی شاعری ترک کر کے افسانہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ان کے افسانوں میں فن اور ہیتی عناصر کا بھرپور شعور ملتا ہے۔انہوں نے شخصی راج کے خلاف اپنی آواز بلند کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کے متنوع مسائل کو موضوع بناتے ہوئے کئی شاہکار افسانے تخلیق کئے ہیں۔اسی لئے پریم ناتھ پردیسی کو ریاست کا پہلا افسانہ نگار تسلیم کیا گیا ہے۔''[۷]

قدوس جاوید نے بھی اپنے مقالہ ''جموں و کشمیر میں اردو افسانہ کے بدلے رجحانات'' میں پردیسی کو ہی کشمیر کا پہلا افسانہ نگار کہا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''۔۔۔آزادی سے قبل کا یہ زمانہ شخصی راج کا زمانہ تھا۔حکومت کے مظالم،استحصال اور

غیر منصفانہ اقدامات سے ریاست کا ہر شخص تنگ آ چکا تھا۔اس صورت حال نے کشمیر کے اردو افسانہ میں ''ارضیت'' یا یوں کہیں کہ اہل کشمیر کی بے بسی، بے کسی، محرومیوں اور نارسائیوں کی تصویر کشی کا رجحان پیدا کیا۔ کشمیر کے پہلے باضابطہ افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسی نے انہی دنوں لکھا تھا:

''کشمیر کا ہر بدنصیب باشندہ خود ایک افسانہ ہے جس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی''۔۸

ان باتوں سے مترشح ہوتا ہے کہ پردیسی کے افسانوں سے ہی کشمیر میں افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ پردیسی کی ابتدائی کہانیاں چھوٹی چھوٹی، دلچسپ اور نصیحت آمیز کہانیاں ہیں۔ اس زمانے میں ٹیگور کے ادب لطیف اور نثری شاعری کے ترجموں نے زبان و بیان کا جادو جگایا تھا اور سدرشن، یلدرم، نیاز اور پریم چند کے افسانوں نے دھوم مچائی تھی۔ پردیسی اسی فضا میں پروان چڑھے۔انہوں نے ابتداء شاعری سے کی لیکن ۱۹۳۲ء سے نثر کی طرف توجہ دی۔شروع شروع میں ان کی نثر میں ٹیگور کا رومانی اسلوب اور ادب لطیف کا اثر جھلکنے لگا لیکن پھر پریم چند کے ''کفن اور انگارے'' جیسے افسانوں کی اشاعت نے ان کا ذہن مکمل طور سے بدل دیا۔اور وہ ۱۹۳۸ء کے بعد حقیقت آمیز ادب کی تخلیق میں مصروف ہوئے۔انہوں نے مختلف فرضی ناموں سے بھی کہانیاں لکھیں اور اپنے فن کو جذباتیت اور رومانیت کے حسین سراب سے نکال کر زندگی کے خارزار میں پہنچا دیا۔اور صحیح معنوں میں اہل کشمیر کے جذبات کی ترجمانی کی، جہاں صرف حسن ہی نہیں تھا بلکہ اس کے پردوں کے پیچھے بھوک، بیکاری اور غلامی کے رستے ہوئے ناسور تھے۔ پردیسی نے کشمیر میں شخصی راج کے خلاف اپنی آواز بلند کی، ساتھ ہی زندگی کے متنوع مسائل کو موضوع بناتے ہوئے کئی شاہکار افسانے تخلیق کئے ہیں۔ان کے تینوں افسانوی مجموعے ''شام وسحر''، ''دنیا ہماری'' اور ''بہتے چراغ'' چھپ چکے ہیں۔ان افسانوں کے علاوہ بھی ان کے کئی افسانے اور ہیں، جو اخباروں اور رسالوں کے پرانے فائیلوں خاص طور پر ''مارتنڈ'' کے ادبی شماروں میں محفوظ ہیں۔ پردیسی نے کشمیری زندگی کی روح میں اتر کر اس کے پوشیدہ درد و داغ کی نقاب کشائی کی ہے۔افسانہ دراصل پردیسی کا مخصوص میدان تھا، اور اس میں ان کی طبیعت کے جوہر چمکے۔خاص طور پر ترقی پسند تحریک سے منسلک ہو جانے کے بعد، انہوں نے جو افسانے لکھے ان میں سماجی اور ابلاغی اقدار کی طرف زیادہ توجہ کی گئی۔ پردیسی نے اپنے افسانوں میں کشمیر کی عکاسی صحیح معنوں میں کی ہے۔ان کے اکثر موضوعات کشمیر اور کشمیریوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کے افسانوں کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔نور شاہ اپنی تصنیف ''جموں و کشمیر کے اردو افسانہ نگار'' میں پریم ناتھ پردیسی کی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''۔۔۔پردیسی نے اپنے افسانوں میں کشمیر کی صحیح عکاسی کی ہے اور کشمیر کو اصلی رنگ

> وروپ میں پیش کیا ہے۔ان کے افسانوں میں اس زمانے کے کشمیر کی حقیقی سندرتا نظر آتی ہے اور وہ بدصورتیاں بھی، جن سے کشمیر اور کشمیریوں کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انہوں نے کشمیر کے تپتے ہوئے جہنم کدوں کی تصویر کشی بھی کی ہے، بھوک اور بے گاری کا احساس بھی دلایا ہے۔ان کے افسانوں کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ وہ زندگی کا مشاہدہ ایک ہمدرد انسان کی طرح کرتے ہیں۔۔۔"[9]

پردیسی کے بعد جو دوسرے افسانہ نگار اس دور سے تعلق رکھتے ہیں ان میں رامانند ساگر اور پریم ناتھ در کا نام لیا جا سکتا ہے۔ رامانند ساگر کا افسانوی مجموعہ ۱۹۴۴ء میں منظر عام پر آیا جس میں بہت سے افسانوں کا پس منظر کشمیر ہے۔ان کے اکثر افسانے تحلیل نفسی کے حیرت انگیز مطالعے ہیں اور ان کا انجام حسرت ناک ہوتا ہے۔"بخشش ،ٹنگمرگ کے اڈے پر، جنگ کے باعث، ردعمل، آئینے اور آب حیات" ساگر کی خوبصورت کہانیاں ہیں۔"نا قابل برداشت" میں انہوں نے شعور کی رو تکنیک کا استعمال بھی کیا ہے۔ بعد میں ان کی سرگرمیاں فلم اور فلمی کہانیوں میں سمٹ کر رہ گئیں۔

اس کے بعد پریم ناتھ در اس میدان میں آئے اور بیسویں صدی کے چوتھے دہے میں اچانک اردو افسانے کے آسمان پر طلوع ہوئے۔شروع شروع میں وہ پردیسی ،رامانند ساگر اور دوسرے مقامی تخلیق کاروں کے ساتھ سرینگر کی ادبی انجمنوں میں شریک ہوئے لیکن انہوں نے اپنے فن کا لوہا ۱۹۴۷ء کے بعد منوایا۔ در کے افسانوں کے دو مجموعے" کاغذ کا واسدیو' اور "نیلی آنکھیں" شائع ہو چکے ہیں۔اس کے علاوہ بھی کئی افسانے رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ان کے پہلے مجموعے" کاغذ کا واسدیو' میں نو (۹) افسانے شامل ہیں۔ جن میں" گیت کے چار بول، دنوں کا پھیر، تحلیل نفسی، کوفتہ، غلط فہمی، جوان، آخ تھو اور کاغذ کا واسدیو' ہیں۔" آخ تھو' ان کے اہم افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ پہلا افسانہ اگست ۱۹۴۷ء میں لکھا گیا تھا اور آخری افسانہ" کاغذ کا واسدیو' اس کے ٹھیک ایک سال بعد لکھا گیا۔ان افسانوں میں درؔ نے عموماً کشمیر کی سماجی زندگی کے مرقع پیش کئے ہیں۔موضوع اور موقف کے لحاظ سے ہر افسانہ انفرادیت رکھتا ہے۔ پریم ناتھ در کے ہاں غضب کا باریک مشاہدہ نظر آتا ہے۔ وہ اس بے چارگی اور لاچاری کی تہوں کو ٹٹول کر نیچے جاتے ہیں اور ان حقائق کو بے نقاب کرتے ہیں، جس نے یہاں کے عوام کو غربت، افلاس اور بھوک کے اندھے غاروں میں دھکیل دیا تھا۔انہوں نے نفسیاتی اور جنسی موضوعات پر بھی قلم اٹھایا اور کامیاب تکنیکی اور اسلوبیاتی تجربے کئے۔انہوں نے اپنی کئی کہانیوں میں شعور کی رو کا بھی تجربہ کیا ہے۔افسانہ" دودھ" اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ پریم ناتھ در کی افسانہ نگاری کے بارے میں ڈاکٹر برج پریمی لکھتے ہیں:

''پریم ناتھ در کے یہاں پریم ناتھ پردیسی کی طرح کشمیر کا ذکر آتا ہے۔لیکن یہ وہ کشمیر نہیں جس کا ذکر اردو کے کئی بڑے افسانہ نگاروں نے کیا ہے اور کشمیر کی روح کو مسخ کیا ہے۔در کے افسانوں میں پردیسی ہی کی طرح کشمیر کے برفیلے پانیوں، سدا بہار جنگلوں، گہری گھاٹیوں اور نیلی آنکھوں والی دوشیزاؤں کا ذکر نہیں ملتا جن کے ساتھ خیالی رومانوں کے طور باندھ کر یہاں کے حسن کی توہین کی گئی ہے۔در کی کہانیوں میں بھی یہاں کے جہنم زاروں کی تصویر ملتی ہے۔بھوک، لاچاری، افلاس، اور بدنصیبی کی کہانیاں ملتی ہیں''۔[۱۰]

اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتداء میں یہاں افسانے روایتی اور رومانی انداز میں لکھے گئے۔اس لیے ان افسانہ نگاروں کو فراموش نہیں کر سکتے جنھوں نے ابتدائی دور میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے ایک ایسا ماحول پیدا کیا جس سے بعد میں آنے والوں کے لیے راہ ہموار ہوگئی۔پردیسی کے معاصرین میں کئی اور نام شامل کئے جا سکتے ہیں۔جنھوں نے کشمیر میں اردو افسانے کو وقار بخشا اور اپنے اپنے انداز سے مختلف سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔بیشتر لوگ ٹیگور اور پریم چند کے ابتدائی دور کی کہانیوں سے متاثر نظر آتے ہیں۔ان کے افسانوی مجموعے شائع نہیں ہوئے۔البتہ یہ لوگ بھی کافی عرصہ تک لکھتے رہے اور مقامی اخبارات میں ان کی کاوشیں شائع ہوتی رہیں۔ان میں خاص طور پر دینا ناتھ، تیرتھ کاشمیری، شیام لال ایمہ، نند لال بے غرض، دینا ناتھ دلگیر، اسیر کاشمیری، کوثر سیمابی، محمود ہاشمی، عزیز گاش، صاحب زادہ محمد عمر، گلزار احمد فدا، وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔تیرتھ کاشمیری اپنے افسانوں کے لئے مواد ہر گوشے سے حاصل کرتے ہیں اور انہیں نئے نئے انداز اور اسلوب سے پیش کرتے ہیں۔تاریخ و اساتیر، عام زندگی اور اس کے اخلاقی پہلوؤں کے بارے میں انہوں نے کئی افسانے لکھے ہیں۔مثلاً ''چندراولی'' کا موضوع اساتیری ہے۔''نربل کے بل رام''، ''اندھی ماں''، ''تلاش حق''، ''جگ چھوٹا سرمایہ'' اخلاقی پہلو لئے ہوئے ہیں۔''پاگل کا خط'' میں انہوں نے مکتوبات کے انداز سے کام لیا ہے۔سو کے قریب ان کے افسانے ہیں۔

اس کے بعد کشمیر میں کئی اچھے افسانہ نگار منظر عام پر آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ صنف بہت مقبول ہوگئی۔ان میں پنڈت شیام لال کبو، عارض کاشمیری اور گوپی ناتھ مٹو کی تخلیقی صلاحیتیں اس صدی کے تیسرے دہے میں بہت نمو پر تھیں۔پنڈت شیام لال کبو کے کئی افسانے ''مارتنڈ'' کے ادبی شماروں میں شائع ہوتے رہے۔جن میں ''حرمانِ نصیب''، ''غربت'' اور ''اوشا'' موضوع، کردار اور پیش کشی کے لحاظ سے اچھے افسانے ہیں۔اسی طرح دینا ناتھ عارض پہلے پریم ناتھ بزاز کے ''ہمدرد'' میں لکھا کرتے تھے پھر ''مارتنڈ'' کے ادبی شماروں کے لئے لکھتے رہے۔ان کا افسانہ ''دل کی تڑپ''

کافی معیاری ہے۔گوپی ناتھ مٹو بھی اچھے تخلیق کار تھے۔افسانہ نگاری کے علاوہ انہوں نے اخلاقی مضامین بھی لکھے ہیں۔ان کا ایک افسانہ ''خونی'' کافی مقبول ہوا۔

دوسرے افسانہ نگاروں میں جن کے افسانے مل جاتے ہیں، پنڈت منوہر کاک، پنڈت شمبھو ناتھ جی کول، پنڈت ترلوکی ناتھ تکو، پنڈت کاشی ناتھ کولا، پنڈت وید لال گیرو، پنڈت سومناتھ جی، پنڈت پرتھوی ناتھ کول، اور پنڈت بھاگیرتی کاشمیری قابل ذکر ہیں۔ پنڈت منوہر کاک کی کہانیوں ''قربانی'' ایک دلچسپ کہانی ہے، جس میں ایک میاں اور بیوی کی نوک جھونک کی تفصیل اچھے انداز میں پیش کی گئی ہے۔ پنڈت شمبھو ناتھ جی کول کی ایک کہانی جو ''مفلسی'' کے عنوان سے ''مارتنڈ'' میں شائع ہوئی تھی، دلچسپ کہانی ہے۔ پنڈت ترلوکی ناتھ کا ایک اچھا افسانہ ''ویشیا'' شائع ہوا تھا جس میں اس طبقے کی ایک عورت کی داستان بیان کی گئی ہے۔ کاشی ناتھ کول کے افسانے بھی اس صدی کے تیسرے دہے میں شائع ہوتے رہے تھے۔ان میں ''محبت'' قابل ذکر ہے، جس میں حسن و عشق کی کرشمہ سازیوں کا اچھا مرقع پیش کیا گیا ہے۔ پنڈت وید لال گیرو بھی اچھے افسانہ نگار تھے۔ان کے افسانوں میں ''حرماں نصیب شانتا'' ایک بدنصیب خاتون کی کہانی ہے۔

پنڈت سومناتھ جی اچھے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ان کا ایک افسانہ ''عجب چور'' ہے۔ پرتھوی ناتھ کول، پریم ناتھ بزاز کے اخبار ''ہمدرد'' کے ایڈیٹر بھی رہ چکے تھے۔ان کے افسانوں میں ''کنیا آشرم'' بے سہارا لڑکیوں کے ایک ادارہ سے متعلق کہانی ہے۔ بھاگیرتی کاشمیری کو بھی افسانہ نگاری کا اچھا ذوق ہے۔ ''رفیقی'' ان کے اچھے افسانوں میں سے ہے۔ چند افسانے شری بت رعناواری کے نام سے بھی اس زمانے میں شائع ہوئے تھے۔جن میں سے ایک ''بھولا پیار'' ایک معصوم کی کہانی ہے۔ان افسانہ نگاروں کی کوششوں سے ایک ایسی کھیپ سامنے آئی جنہوں نے آگے چل کر افسانہ کی تاریخ رقم کی۔

علی محمد لون نے بھی کئی افسانے تخلیق کیں ہیں۔ان کا پہلا افسانہ ''گھر سے کالج تک'' جموں کے ماہ نامہ ''پریم'' میں چھپا تھا۔افسانہ لون کی پہلی دلچسپی تھی، انہوں نے بہت سے افسانے لکھے جو سب کے سب ملک کے ادبی رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ان میں سے کئی کہانیاں فنی لحاظ سے اونچا پایہ رکھتی ہیں۔لون کو کہانی لکھنے کا اچھا شعور ہے۔وہ ہر کہانی کا ٹھاٹھ نئے انداز سے باندھنے کی کوشش کرتے ہیں۔لون کے موضوعات کی طرح ان کی تکنیک میں بھی بڑا تنوع ہے۔کشمیری زندگی اور اس کی تہذیب اور شایستگی کی طرف اشارے اکثر افسانوں میں ملتے ہیں اور کئی افسانے کشمیر کی زندگی پر مبنی ہیں۔ان کے افسانوں کے عنوان ہیں، ''بچے''، ''شب خون''، ''یہ محلّہ''، ''مونچھوں والی گڑیا''، ''سکھ کا ساحل''، ''مطلب یہ کہ''، ''مسکراہٹ کا زخم''، ''آرزو کا سلسلہ''، ''تم سب میرے ہو''، ''تعویذ''، ''بت شکن''، ''مہمان''، ''چھینٹے اور انسان'' اور ''پاپی پجاریوں کی سنتان''۔اسلوب کا ستھراین اور اظہار میں اعجاز، لون کی اکثر کہانیوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔

ابھی افسانہ کے بیج سے کونپلیں نکلنے شروع ہوگئیں تھیں کہ تقسیم کا سانحہ پیش آیا۔جس سے پورے برصغیر میں اتھل پتھل شروع ہوئی اور زندگی مفلوج ہوکر رہ گئی۔اس سانحہ کے اثرات براہ راست ہماری ریاست پر بھی پڑ گئے۔یہاں کے حالات بھی دگرگوں ہو گئے، ہر طرف افراتفری کا ماحول پیدا ہوگیا۔سیاسی اور سماجی سطح پر بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اور جو لکھنے والوں کا کارواں سامنے آ گیا تھا وہ بھی دیکھتے دیکھتے بکھر گیا۔ادیبوں کی ایک بڑی کھیپ پاکستان چلی گئی۔جن میں قدرت اللہ شہاب، کوثر سیمابی، کیف اسرائیلی، محمد عمر نور الٰہی، طالب گورگانی، عزیز گاش وغیرہ قابل ذکر ہیں۔جو ادیب اور شعراء یہاں رہے وہ کلچرل فرنٹ کے بینر تلے جمع ہونے شروع ہو گئے جن میں زیادہ تر وہی ادیب تھے جو ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔اس بارے میں نور شاہ رقم طراز ہے:

> ''۱۹۴۷ کے اواخر اور ۱۹۴۸ کے اوائل میں کشمیر وادی میں ایک تمدنی محاذ یعنی کلچرل فرنٹ کی بنیاد رکھی گئی۔اس محاذ میں سب سے پہلے جن لوگوں نے شمولیت کی وہ یہی ترقی پسند ادیب اور شاعر تھے، یہ وہ زمانہ تھا جب نیم برصغیر تقسیم ہو چکا تھا۔دو نئی مملکتیں وجود میں آ چکی تھیں۔مہاجرین کا مسئلہ نہایت ہی خطرناک صورت اختیار کر چکا تھا اور ادھر اپنے کشمیر پر حملہ ہو چکا تھا۔مختصر یہ کہ ایک عجیب طرح کی افراتفری، طوائف الملوکی اور خوف و ہراس کا دور دورہ تھا۔اس پس منظر میں تمدنی محاذ یعنی کلچرل فرنٹ کا وجود میں آنا اور ترقی پسند مصنفین کا اس میں رضا کارانہ طور پر شامل ہونا ریاست کی ادبی تحریک میں ایک سنہری باب کا درجہ رکھتا ہے''۔[۱۱]

ان باتوں سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ کشمیر کے افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

حوالے

۱۔پروفیسر عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو، جلد دوم، (سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، ۱۹۸۲) ص ۴۵۷

۲۔ دیپک بدکی، عصری شعور، تنقیدی مضامین وتبصرے، جلد دوم، (سرینگر: میزان پبلشرز سرینگر کشمیر، ۲۰۰۸) ص ۴

۳۔ برج پریمی، جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشونما، (جموں: رچنا پبلی کیشنز جموں، ۲۰۱۳) ۲۷، ۲۶

۴۔ پروفیسر عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو، جلد دوم، (سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، ۱۹۸۲) ص ۴۳۰

۵۔ پروفیسر عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو، جلد دوم، (سرینگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، ۱۹۸۲) ص ۴۴۴

۶۔ برج پریمی، جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشونما، (جموں: رچنا پبلی کیشنز جموں، ۲۰۱۳) ۸۲

۷۔ سلیم سالک، جموں وکشمیر کے منتخب اردو افسانے، (سرینگر: میزان پبلشرز، ۲۰۱۱) ص ۱۹

۸۔ پروفیسر قدوس جاوید، جموں وکشمیر میں اردو افسانہ کے بدلتے رجحانات، ص ۹

۹۔ نورشاہ، انتخاب اردو ادب، ''ریاست جموں وکشمیر (۱۹۴۷تا۱۹۷۱)، (سرینگر: کلچرل اکیڈمی، ۱۹۷۳) ص ۲۱

۱۰۔ برج پریمی، جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشونما، (جموں: رچنا پبلی کیشنز جموں، ۲۰۱۳) ص ۲۹

۱۱۔ نورشاہ، انتخاب اردو ادب ''ریاست جموں وکشمیر (۱۹۴۷تا۱۹۷۱)، (سرینگر: کلچرل اکیڈمی، ۱۹۷۳) ص ۷